بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس سے پہلے ہم یہ بتا چکے ہیں کہ پاکستان کے اصولاً دارالاسلام بن جانے کے بعد سے جماعت اسلامی جس لائحہ عمل پر کام کر رہی ہے اس کے بنیادی مقاصد کیا ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم چار بڑے بڑے مقاصد کی نشان دہی کر چکے ہیں اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ ان میں سے پہلے دو مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہم اب تک کیا کچھ کرتے رہے ہیں اور آگے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اب ہمیں تیسرے اور چوتھے مقصد کی تشریح کرنی ہے۔

ہمارا تیسرا مقصد یہ ہے کہ "اس نئی مملکت کی تعمیر لازماً انہی بنیادوں پر ہو جو قرارداد مقاصد میں متعین کر دی گئی ہیں اور کسی ایسی تدبیر کو نہ چلنے دیا جائے جو قرارداد مقاصد کو بالائے طاق رکھ کر یہاں ایک غیر اسلامی طرز کا نظام حکومت قائم کرنے کے لیے اختیار کی جائے۔"

اس کام کی اہمیت کیا اور کس قدر ہے، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم قرارداد مقاصد کی اصلی قدر و قیمت کو اچھی طرح مشخص کریں۔ اس قرارداد سے پاکستان کی آئینی حیثیت میں جو تغیر ہوا ہے وہ درحقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ ملک **اصولاً** دارالاسلام بن گیا ہے۔ اس فوری تغیر نے وہ سب کچھ ہمیں نہیں دے دیا ہے جو ہمیں مطلوب تھا۔ ابھی ایک بہت بڑا کام باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس مملکت کو **عملاً** دارالاسلام بنایا جائے۔ تمثیل کے پیرائے میں اس کو یوں سمجھیے کہ قرارداد مقاصد تو محض ایک کلمۂ شہادت ہے جسے ادا کر کے ایک غیر مسلم نے قبول اسلام کا اعلان کیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی بڑی چیز ہے اور اس کے شرعی نتائج اپنی جگہ بڑے اہم ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مگر مجرد قبول اسلام سے وہ سب کچھ حاصل نہیں ہو جاتا ہے جو تبلیغ اسلام

کا مقصود ہے۔ اس کے بعد ضروری ہے کہ جو شخص اسلام میں داخل ہوا ہے اس کے طریقِ فکر اور طرزِ زندگی میں بھی اسلام کے منشا کے مطابق تغیر ہو۔ وہ فرض کو فرض مانے اور اسے ادا کرے۔ حرام کو حرام جانے اور اس سے بچے، خدا اور رسول کے حکم کو اساسی قانون تسلیم کرے اور اس کے آگے سر جھکائے، شریعت خداوندی کی مقرر کی ہوئی حدوں کو پہچانے اور اپنے عمل کو ان کے اندر محدود کرے۔ یہ تغیرات جب تک اس کی زندگی میں نہ ہونگے اس کی حالت اُس نو مسلم کی سی ہوگی جو بس کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا ہو، باقی رہے خیالات، اخلاق اور اعمال، تو ان کے لحاظ سے وہ ویسا ہی غیر مسلم رہے جیسا کلمہ خوانی سے پہلے تھا۔ یہ حالت ظاہر ہے کہ کسی فرد کے معاملہ میں بھی قابلِ اطمینان نہیں ہو سکتی، کجا کہ ایک مملکت اسلامیہ کے معاملہ میں قابلِ اطمینان ہو سکے۔ جہاں تک ایک غیر تحریری دستور رکھنے والی مملکت کا تعلق ہے، اس میں تو یہ تغیرات تدریجی "رواج" کی تبدیلی سے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک تحریری دستور رکھنے والی مملکت کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اس کے دستور میں اُن تمام ضروری تغیرات کو واضح طور پر ثبت کیا جائے جو اِس "کلمہ خوانی" کی مناسبت سے اس کے نظام میں ہونے چاہئیں۔ اس کے بغیر نہ اس کا پچھلا طریقِ عمل بدل سکتا ہے اور نہ اسے اسلام کے مطابق کسی طریقِ عمل کا پابند بنایا جا سکتا ہے۔

یہ تو ہے وہ کام جو ابھی دارالاسلام کی تعمیرِ نو کے سلسلہ میں کرنا باقی ہے۔ اب دوسری طرف ذرا اُن حالات کو دیکھیے جن میں یہ باقی ماندہ کام انجام پانا ہے۔ ہم اس امرِ واقعی سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے کہ ہمارے اس ملک میں اسلام کی طرف رجحان خواہ کتنا ہی عام ہو، اس کا علم بہت کم ہے اور اسلامی طور طریقوں کی عملی تربیت کا تو اس سے بھی زیادہ فقدان ہے۔ ہماری سیاست کی زمامِ کار جس گروہ کے ہاتھ میں ہے اس کا پورا ذہنی نشو و نما مغربی تعلیم اور مغربی ماحول میں ہوا ہے۔ ہمارے نظم و نسق کی مشینری جن ملازمینِ حکومت کے ذریعہ سے چل رہی ہے، انہوں نے آج تک جتنی بھی تربیت پائی ہے مغربی طرز پر ہی حکومت کا انتظام کرنے کی پائی ہے۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جس کے شعور اور ارادے کی صحت اور جس کی فرض شناسی پر ہماری قومی زندگی کا مدار ہے، افسوسناک حد تک دماغی انتشار

میں مبتلا ہے۔ اور اگر کچھ تھوڑا بہت اسلامی شعور اُس میں پیدا ہُوا بھی ہے تو ارادے کی کمزوری اور فرض سے غفلت نے اس کو بہت کچھ غیر مؤثر بنا دیا ہے۔ رہے عوام جن کا ووٹ ایک جمہوری نظام میں بہرحال فیصلہ کن ہوتا ہے، تو وہ ہمارے ہاں ابھی نہ اس لائق ہیں کہ اسلامی دستور اور غیر اسلامی دستور کے فرق کو سمجھ سکیں، اور نہ ان کے اندر ابھی تک ایسی طاقت ور اور منظم رائے عام پیدا ہوسکی ہے کہ مملکت کی گاڑی کو غلط سمت میں جانے دیکھ کر روک سکیں اور صحیح سمت کی طرف مڑنے پر مجبور کرسکیں۔ اس حالت میں اصولی دارالاسلام کو عملی دارالاسلام بنانے کا وہ عظیم الشان کام جو ابھی باقی ہے، اُس سے بہت زیادہ دُشوار نظر آنے لگتا ہے جتنا بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے۔

یہ دُشواری بھی شاید ہلکی ہی ہوتی اگر برسرِ اقتدار گروہ صرف اسلام سے ناواقفیت کا مریض ہوتا، اس سے فرار کی خواہش کا روگی نہ ہوتا۔ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ اگر کوئی چیز دردِ سر کی موجب ہوسکتی تھی تو وہ بس یہ کہ مغربی افکار و نظریات اور مغربی ریاستوں کے نظائر سے ان کی فریفتگی کیسے دُور کی جائے اور اسلامی مملکت کی دستوری خصوصیات کس طرح ان کے ذہن میں اتاری جائیں اور ایک نئی عمارت ایسے معماروں کے ہاتھوں کس طرح بنوائی جائے جو اس طرزِ تعمیر سے بالکل نابلد ہیں۔ مشکلات اتنی ہی ہوتیں تو انہیں رفع کرنے کے لیے سعی فرہاد درکار نہ ہوتی۔ لیکن یہاں معاملہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم اسے بھول نہیں سکتے کہ پاکستان بننے سے پہلے یہ لوگ اسلامی ریاست کے مفہوم اور تصور میں کیسا کچھ گھپلا کرتے رہے ہیں۔ نہ یہ بھول سکتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد مسلسل ۱۹ مہینے تک یہ کس طرح اسلامی ریاست کے سوال کو ٹالتے رہے اور اس سے بچنے کے لیے کیسی کیسی چالیں انہوں نے چلیں۔ نہ یہ بھول سکتے ہیں کہ قراردادِ مقاصد کی کڑوی گولی کس بدمزگی کے ساتھ انہوں نے حلق سے اتاری۔ نہ یہ بھول سکتے ہیں کہ قراردادِ مقاصد پاس کرنے کے بعد کوئی برائے نام تغیر بھی انہوں نے پچھلے ۳۰ مہینوں کے اندر اپنی حکومت کے طور طریق میں نہیں کیا جسے اس امر کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہو کہ انہوں نے یہ قرارداد نیک نیتی کے ساتھ منظور کی تھی۔ پھر وہ دستوری سفارشات تو ابھی پچھلے ہی سال ہمارے

سامنے آچکی ہیں جو ان حضرات نے ایک مدت کی کاوش کے بعد مرتب کی تھیں اور جن میں یہ لوگ بالکل بے نقاب ہو کر ایک سراسر غیر اسلامی دستور کا خاکہ لیے ہوئے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔
ان سب باتوں کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اب جو مہم درپیش ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ سخت ہے جو قرارداد مقاصد کی منظوری سے پہلے درپیش تھی۔

ان حالات میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمارا پروگرام یہ ہے کہ:
ایک طرف اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں اور اس کی دستوری خصوصیات کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کی کوشش مسلسل جاری رکھی جائے، تاکہ تعلیم یافتہ طبقے کی ذہنی الجھنیں بھی دور ہوں اور ہمارے دستور سازوں میں سے بھی جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ اس معاملہ میں روشنی حاصل کرنا چاہیں انہیں روشنی مل سکے۔ اس غرض کے لیے ہم نے ۱۹۵۰ء میں اپنے سابق لٹریچر پر "اسلامی ریاست" کے عنوان سے ایک اور سلسلے کا اضافہ کیا جس کے چار حصے "شہریت اور اس کے حقوق و فرائض"، "غیر مسلموں کے حقوق"، "کارکنوں کی ذمہ داریاں"، اور "اطاعت کے حدود و شرائط" کے نام سے اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں۔
دوسری طرف عوام الناس کو اسلامی ریاست کے تصور سے، قرارداد مقاصد کے مفہوم و مدعا اور اس کے تقاضوں سے، اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے معاملہ میں برسر اقتدار طبقہ کی کوتاہیوں سے پیہم آگاہ کیا جاتا رہے، تاکہ رائے عام اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ بیدار اور تیار ہو اور اس قرارداد کو پس پشت ڈال دینا یا اسے مکر و فریب کا شکار بنا لینا کسی کے لیے آسان نہ رہے۔ یہ کام مارچ ۱۹۴۹ء کے بعد سے مسلسل ہو رہا ہے اور انشاء اللہ اسے آئندہ بھی جاری رکھا جائیگا۔ البتہ اس میں حکمت اور اعتدال کے اِس تقاضے کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایک بات کی اتنی زیادہ تکرار بھی نہ کی جائے کہ عام طبائع اس سے اُکتا جائیں اور اس کا اثر لینے کے بجائے اُلٹا اس سے استخفاف برتنے لگیں۔

تیسری طرف برسرِ اقتدار طبقے کے ہر اس قدم کی شدت سے مزاحمت کی جائے جو وہ قراردادِ مقاصد کے منشا کے خلاف دستور بنانے کے لیے اٹھائے۔ پچھلے سال بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کے متعلق دستور ساز اسمبلی کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے جو سفارشات پیش کی تھیں، ان کی اشاعت کے بعد فوراً ہی ان پر تنقید کی گئی اور خدا کے فضل سے ملک کے تمام اسلامی رجحانات رکھنے والے طبقوں نے ہر قسم کے گروہی تعصبات کو نظر انداز کر کے پورے اتحاد کے ساتھ برسرِ اقتدار طبقے کے اس قدم کی مزاحمت کی۔ یہ ایک اچھا سبق تھا جو ان لوگوں کو دیا گیا، اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی جب کبھی وہ ایسی غلطی کریں گے، ان کو ایسا ہی سبق دیا جائے گا۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً یہ لوگ کوئی نہ کوئی ایسا شوشہ چھوڑتے رہتے ہیں جس سے عوام الناس کی توجہ ملک کے بنیادی مسائل سے ہٹ کر کسی اندرونی یا بیرونی قضیے کی طرف مرتکز ہو جاتی ہے، اور اس سے فائدہ اٹھا کر یہ عارضی طور پر اپنا رنگ جما لیتے ہیں، لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی تائید سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس طرح کی کوئی تدبیر انہیں یہ موقع کبھی نہ دے سکے گی کہ یہ اپنا من مانا دستور اس ملک پر مسلط کر سکیں۔

ہمارے لائحۂ عمل کے بنیادی مقاصد میں سے چوتھا اور آخری مقصد یہ ہے کہ "آئینی ذرائع سے اس مملکت کی موجودہ قیادت کو ایک صالح قیادت سے تبدیل کیا جائے اور اُسے بروئے کار لا کر قوانین، نظم و نسق، تعلیم، مالیات، معاشی نظام، فلاحِ عمومی، دفاع، اور خارجی سیاست میں ایسی اصلاحات کی جائیں جن سے پاکستان دنیا میں اسلام کی صحیح نمائندگی کرنے والا ایک ملک بن جائے۔"

اِس مقصد کو اور اُس پروگرام کو جو اس کے لیے ہم نے اختیار کیا ہے، سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چند مقدمات ذہن نشین کر لیے جائیں:-

(۱) ہمارا اجتماعی نصب العین ایک مسلمان قوم ہونے کی حیثیت سے اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف ہم خود اُن تمام روحانی، اخلاقی اور مادی برکات سے متمتع ہوں جو اسلام میں

عطا کرتا ہے، اور دوسری طرف ہم اپنی قومی زندگی میں اسلامی عدل، اسلامی اخلاق، اور اسلامی نظامِ حیات کا ایسا مظاہرہ کریں جس سے تمام دنیا کے سامنے اسلام کے دینِ حق ہونے کی شہادت ادا ہو اور وہ مقصد پورا ہو جس کے لیے ہم ایک امت بنائے گئے ہیں، وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔

(۲) یہ نصب العین کسی طرح متحقق نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہمارے اجتماعی معاملات کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو حکومت کی صلاحیت اور انتظام کی قابلیت رکھنے کے ساتھ اسلامی ذہنیت اور اسلامی سیرت بھی رکھتے ہوں اور یہ استعداد بھی اُن میں ہو کہ زمانۂ جدید کی ایک ترقی یافتہ ریاست کا نظام اسلام کی ہدایت کے مطابق چلا سکیں۔

(۳) جہاں تک موجودہ قیادت کا تعلق ہے، اس کا کوئی بڑے سے بڑا وکیل بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ ان اوصاف سے متصف ہے۔ بلکہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس میں جو کچھ بھی اوصاف پائے جاتے ہیں وہ ان اوصافِ مطلوبہ کے عین برعکس ہیں۔ لہٰذا اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس قیادت کو ایک صالح قیادت سے تبدیل کیا جائے۔

(۴) اگر ملک میں حکومت کسی خاندان یا کسی طبقہ و گروہ کا اجارہ بن گئی ہو اور اسے تبدیل کرنے کے لیے کوئی آئینی طریقِ کار موجود ہی نہ ہو، تب تو مسلح انقلاب کی سعی ناگزیر ہے۔ لیکن اگر ملک میں ایک جمہوری نظام قائم ہو، اور اس میں آئینی طریقِ کار سے حکمرانوں کی تبدیلی کا کچھ بھی امکان باقی ہو تو پھر صحیح راستہ یہی ہے کہ عوام الناس کو فاسق قیادت اور صالح قیادت کے فرق سے آشنا کیا جائے، صالح قیادت کی طلب اور اس کی معرفت ان میں پیدا کی جائے، اسلامی طرز پر ملک کے انتظام کا ایک واضح پروگرام ان کے سامنے پیش کیا جائے، اور بتدریج ان کو اس لائق بنایا جائے کہ وہ اپنے اندر سے ایسے صالح آدمی چھانٹ لیں جو اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

(۵) جمہوری نظام میں بگاڑ کی اصلاح محض باتوں سے نہیں ہو جایا کرتی بلکہ اس کے لیے

برسوں کی منظم جدوجہد اور عرق ریزی و جانفشانی درکار ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں عوام الناس کے ووٹوں سے حکمران منتخب کیے جاتے ہوں وہاں اگر بگاڑ پایا جاتا ہے تو لامحالہ اس کا سرچشمہ چار ہی چیزیں ہونگی:

عوام الناس کی بے شعوری اور اخلاقی گراوٹ،

ایک ایسے با اثر طبقے کی موجودگی جو عوام کی ان کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اقتدار کی مسندوں پر قبضہ جما رہا ہو، اور معاشرے میں ایسے متعدد عناصر کی موجودگی جو ان علمبرداران شر کے حامی و ناصر ہوں۔

نظم و نسق کی مشینری کا ایسے بے ضمیر اور نا فرض شناس کارکنوں کے ہاتھ میں ہونا جو آئین کے حدود کو توڑ کر انتخابات میں بگاڑ کے علمبرداروں کی مدد کرتے ہوں، اور

انتخاب کے طریق کار میں ایسی بنیادی غلطیوں کا موجود ہونا جن کی وجہ سے صحیح انتخاب نہ ہو سکتا ہو۔

ان چاروں اسباب خرابی کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھ لے تو اسے اس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ جب تک یہ اسباب باقی ہیں، قیادت کبھی فساق و فجار کے ہاتھ سے نہیں نکل سکتی اور صالح نظام کبھی برپا نہیں ہو سکتا۔ پھر اسے اس امر میں بھی کوئی شبہ نہ رہے گا کہ انتخابات سے بے تعلق رہ کر محض تبلیغ و تلقین اور تزکیۂ نفس کے ذریعہ سے نظام حق قائم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اسے اس امر میں بھی کوئی تردد نہ رہے گا کہ اصلاح جب بھی کرنی ہو، اسی طرح کرنی پڑے گی کہ براہ راست انتخابات میں دخل دیا جائے اور پیہم منظم کوشش اور حکیمانہ تدبیر کے ساتھ ان خرابیوں کی جڑیں کاٹی جاتی رہیں، یہاں تک کہ آخرکار عوام الناس صحیح طریقہ سے، صحیح مقصد کے لیے صحیح آدمی منتخب کرنے کے قابل ہو جائیں۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس سے یہاں اسلام برسرِ اقتدار آسکتا ہے

یہی کام ہے جو ہم نے پچھلے سال سے شروع کیا ہے۔ انتخاب کے طریقوں کی اصلاح کے

لیے جو پروگرام ہم نے اختیار کیا ہے وہ "جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد" میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔ ملکی انتظام کے مختلف شعبوں میں جو اصلاحات ہم چاہتے ہیں ان کا مفصل نقشہ ہم نے اپنے "منشور" میں پیش کر دیا ہے ۔۔۔ سردست چونکہ انتخابات صرف صوبوں میں ہو رہے ہیں، اس لیے ابھی ہم نے صرف یہ بتایا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی حدبندیوں کے اندر ایک صوبائی حکومت کے اختیارات سے کام لے کر اسلام کے منشا کے مطابق زندگی کے نظام میں کیا اصلاحات کی جا سکتی ہیں۔ آگے چل کر اگر کبھی مرکزی انتخابات کی نوبت آئی تو ہم انشاء اللہ یہ بھی بتائیں گے کہ پورے ملک کے نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کیا صورت ہے ۔۔۔ ان دو چیزوں کو لے کر ہم رائے عام کی تربیت اور تنظیم کا کام اب عملاً کر رہے ہیں اور پہلی ہی انتخابی جدوجہد میں جو نتائج ہم نے حاصل کیے ہیں وہ ہماری مجلس شوریٰ کی روداد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر اس طریقے پر مسلسل کام کیا جاتا رہے تو رفتہ رفتہ عوام کی بے شعوری اور اخلاقی گراوٹ بھی دور ہوگی، ان کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے عناصر کا زور بھی ٹوٹے گا، حکومت کے نظم ونسق میں جس قدر بھی صاحب ضمیر اور فرض شناس عناصر موجود ہیں ان کی ہمدردیاں بھی ایماندار لوگوں کے ساتھ شامل ہوتی چلی جائیں گی اور ان کی مدد اور رائے عام کی تائید سے بالآخر اُن بے ایمانیوں کا سدباب کیا جا سکے گا جو انتخابات میں فساق کے سر کامیابی کا سہرا باندھا کرتی ہیں۔ اس کے بعد کہیں جا کر اس امر کا امکان پیدا ہوگا کہ یہاں اقتدار کی باگیں ان صالح انسانوں کے ہاتھ میں آئیں جو پورے اسلام کو اس کی اصلی شان کے ساتھ اس ملک میں نافذ کرنے والے ہوں

کوئی اللہ کا بندہ آنکھیں رکھتا ہو اور دیکھنا چاہتا ہو تو دیکھ سکتا ہے کہ دراصل ہمارا یہ آخری قدم نظامِ فسق وضلال کے قلعے کی طرف براہِ راست پیش قدمی ہے اور ایک فیصلہ کن ضرب ہے جو ٹھیک اس کی فصیلوں پر جا کر پڑتی ہے۔ اگر ہم اپنے مقاصد میں سے صرف پہلے تین مقاصد کے لیے کام کریں، یا چوتھے مقصد کو بھی اپنے لائحہ عمل میں لے تو لیں مگر اسے حاصل کرنے کے لیے

انتخابات میں عملی حصہ نہ لیں، تو نہ قیادتِ فاسقہ کبھی ہٹ سکتی ہے اور نہ وہ قیادتِ صالحہ کبھی قائم ہو سکتی ہے جس کے قیام پر نظامِ اسلامی کا قیام منحصر ہے۔ یہ عملی انقلاب اگر رونما ہو سکتا ہے تو اسی آخری قدم سے ہو سکتا ہے جو ہم نے اب اٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہم نے یہ قدم نہ اٹھایا تھا کسی نہ کسی طرح ہمیں برداشت کیا جا رہا تھا۔ مگر جونہی کہ یہ قدم ہم نے اٹھایا، قیادتِ فاسقہ اور اس کے مددگار سب کے سب یک لخت بھڑک اٹھے۔ پاکستان سے لیکر ہندوستان تک خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ پرانے پرانے دشمن، جو کبھی جمع نہ ہو سکتے تھے، اس خطرے کو آتے دیکھ کر متحد ہو گئے۔ دیوبند اور بریلی گلے مل گئے۔ پیروں اور وہابیوں میں اتحاد ہو گیا۔ اہلِ حدیث اور منکرینِ حدیث متفق ہو گئے۔ قادیانیوں اور احراریوں نے مل کر لیگ کا دامن تھام لیا۔ ہماری دس دس بارہ بارہ برس کی پرانی تحریروں میں سے وہ گمراہیاں ٹپکنی شروع ہو گئیں جو پہلے کبھی نظر نہ آئی تھیں یا دین کے لیے خطرہ نہ سمجھی گئی تھیں۔ ہندوستان کے کانگرسی علماء تک دینی حمیت کے تقاضوں سے مجبور ہو گئے کہ اپنے دارالافتاؤں کے گولہ بارود سے پاکستان مسلم لیگ کی مدد فرمائیں۔ حد یہ ہے کہ مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کی جماعت کے بعض مشائخ کو بھی پہلی مرتبہ اسی وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ پوری خدا ترسی اور شانِ تواضع کے ساتھ جماعت اسلامی کی وہ ساری برائیاں گنوا دیں جو ان کے خیالِ مبارک میں تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر لوگوں کو یقین نہ آئے کہ یہ قدم ہم نے ٹھیک صحیح رُخ پر اٹھایا ہے تو نہ معلوم اور کن علامات سے وہ حق کو پہچانیں گے۔ ہمیں تو اس عام اضطراب میں شیطان کی اُس گھبراہٹ کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں جو اسلام کو اپنی آخری پناہ گاہ کے قریب آتے دیکھ کر اس پر طاری ہوا کرتی ہے۔

جس وقت یہ اوراق ناظرین کی نگاہوں سے گزر رہے ہونگے اُس کے بعد ہی انشاء اللہ متصلاً ارکانِ جماعت اسلامی کے پاس جماعت کے نئے دستور کا وہ مسودہ پہنچ جائے گا جس پر آئندہ نومبر کے اجتماعِ عام میں بحث ہونی ہے۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس موقع پر اس

مجوزہ دستور کے متعلق چند امور کی توضیح کر دی جائے تاکہ رفقاء کو اس کے سمجھنے میں سہولت ہو اور اجتماعِ عام میں ہم کو ایسی بحثوں اور غیر ضروری ترمیموں سے سابقہ نہ پیش آئے جو محض دستور کے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوں۔

ہمارا پچھلا دستور اب سے دس سال پہلے اُس وقت بنا تھا جب جماعت قائم ہوئی تھی۔ اُس وقت ہم نے صرف چند اصولی باتیں دستور میں درج کر دی تھیں اور تفصیلات کو قصداً چھوڑ دیا تھا، تاکہ تحریک اور نظام کی وسعت و ترقی کے ساتھ ساتھ جماعت کا ضابطۂ عمل خود بخود بنتا چلا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد، پچھلے دس سال کے دوران میں پوری جماعت اپنے مجموعی عملدرآمد سے بتدریج اپنا ایک دستور بناتی رہی ہے جو کہیں لکھا ہوا موجود نہیں ہے، بلکہ صرف جماعتی رواج اور جماعتی روایات کے اندر محفوظ ہے۔ جہاں تک جماعت کے کام کا تعلق ہے، وہ اب بھی کسی تحریری دستور کا محتاج نہیں ہے، اور آئندہ بھی ایک مدت تک توقع ہے کہ وہ اس کے بغیر چل سکتا ہے۔ لیکن کچھ دوسرے وجوہ ہیں جن کے باعث اب ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ جماعت کے پورے نظام اور ضابطۂ عمل کو واضح طور پر ایک دستور کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔

جماعت کی تحریک اب دعوتِ عام کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اور اس موقع پر ہر وہ شخص جو جماعت سے روشناس ہوتا ہے، یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس جماعت کا نظام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نظام جماعت کو ہمارا ہر کارکن جماعت کی روایات کے حوالہ سے ہر شخص کے سامنے تو بیان نہیں کر سکتا۔ لامحالہ کوئی لکھی ہوئی چیز ہونی چاہیے جو کسی کو دی جا سکے۔

دعوتِ عام کے سلسلہ میں جماعت کو صرف خالی الذہن لوگوں یا ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھنے والوں ہی سے سابقہ درپیش نہیں ہے، بلکہ ایسے لوگوں سے بھی ہے جو اس کے خلاف تعصب یا عناد رکھتے ہیں۔ ان میں سے بکثرت لوگ غلط فہمی کی بنا پر یا قصداً جماعت کے نظام کی

غلط تعبیریں کرتے ہیں اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ یہ کوئی فسطائی طرز کی جماعت ہے یا کوئی خفیہ تحریک ہے، یا اس میں پاپائیت کا رنگ ہے، یا یہ کسی شخص خاص کے مریدوں کا گروہ ہے۔ اس طرح کی افترا پردازیوں کا سدِ باب اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ہمارا دستور کاغذ پر لکھا ہوا موجود ہو جسے ہر پڑھا لکھا آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور ان پڑھ اپنے کانوں سے سن لے۔

جماعت کے نظام اور کام کو جو لوگ اس وقت چلا رہے ہیں وہ سب فانی ہیں اور حوادث کے شکار بھی ہو سکتے ہیں، مگر جماعت کو باقی رہنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل یہ نظام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو اس جماعت کی روایات سے اچھی طرح واقف نہ ہوں اور ایک واضح دستور العمل موجود نہ ہونے کی صورت میں ایسی غلطیاں کر جائیں جو جماعت کا حلیہ ہی بگاڑ دیں۔ اس لیے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جن لوگوں نے اب تک اس کام کو صحیح بنیادوں پر چلایا ہے وہ بعد کے آنے والوں کے لیے نظامِ جماعت کی شکل و صورت محفوظ کر دیں۔

اِن وجوہ کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے جس کی بنا پر نیا دستور مرتب کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہمارا پرانا دستور جو دستورِ جماعت اسلامی کے نام سے مطبوعہ شکل میں موجود ہے وہ اب سے دس سال پہلے بالکل مختلف حالات میں مرتب ہوا تھا۔ اب ان حالات کے بدلنے کے بعد ناگزیر ہے کہ ہمارا نیا دستور بھی تحریری صورت میں شائع ہو جائے، ورنہ پرانے دستور کو دیکھ کر لوگ بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

اس دستوری مسودے کو ہماری مرکزی مجلسِ شوریٰ کی مقرر کی ہوئی ایک کمیٹی نے مرتب کیا ہے، اور اس کے بعد پھر مجلسِ شوریٰ ہی کی مقرر کی ہوئی ایک دوسری سب کمیٹی نے اس پر نظرِ ثانی کی ہے۔ اس میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ تر اسی رواج کو جس پر اب تک جماعت کا نظام چلتا رہا ہے ضبطِ تحریر میں لے آیا جائے۔ حتی الامکان جماعت کے پچھلے رواج کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے اور اس میں اگر کوئی جزوی ردوبدل کیا گیا ہے تو صرف ان مقامات پر جہاں جماعت کے پرانے کارکنوں

نے اپنے تجربات کی بنا پر اصلاح کی، یا مختلف رواجوں کو ختم کر کے ایک مقرر ضابطہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے، یا کسی ایسے دستوری مسئلے کا واضح جواب دینا ضروری سمجھا ہے جو آگے جماعت کو پیش آسکتا ہے اور جس کا کوئی جواب ہمارے اب تک کے دستوری رواج میں موجود نہیں ہے۔ تاہم کچھ چیزیں اس دستور میں نئی بھی ہیں جن سے اب تک ہمارے رفقاء جماعت آشنا نہ تھے۔ ہم ان کی طرف خاص طور پر رفقاء کو اس لیے توجہ دلا رہے ہیں کہ وہ خصوصیت کے ساتھ ان نکات پر زیادہ غائر نگاہ ڈالیں اور ان کے بارے میں ایک سوچی سمجھی رائے قائم کر کے آئیں۔

ان دستوری تجاویز میں اسلام کے شورائی نظام کے اصول، مزاج اور روح کو سمجھ کر اپنے نظام جماعت کی ضروریات پر ان کو منطبق کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اس میں دو باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایک یہ کہ جن دستوری نکات کے بارے میں کوئی واضح نص موجود ہے، ان میں نص کی پوری پابندی کی جائے۔ دوسرے یہ کہ جن دستوری نکات کا کوئی قطعی فیصلہ نص میں نہیں کیا گیا ہے ان میں متعدد مباح صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لی جائے جو ہمارے جماعتی نظام اور ہمارے موجودہ حالات کے لحاظ سے موزوں ترین ہو۔ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے، اس میں تو کوئی ردو بدل کرنے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ البتہ دوسری قسم کے معاملات میں تمام ارکان جماعت کو غور کرنا چاہیے کہ آیا وہ تجاویز درست ہیں جو مجوزہ دستور میں درج کی گئی ہیں، یا وہ اپنے پاس ان سے بہتر کچھ تجاویز رکھتے ہیں۔

مثلاً یہ بات منصوص ہے کہ جماعتی زندگی میں تمام اہم معاملات کا فیصلہ مشورے سے کیا جائے۔ اس چیز کی پابندی پر ہم مجبور ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مجوزہ دستور میں اوپر سے نیچے تک نظام جماعت کے ہر درجے میں مشورے کو لازم کیا گیا ہے۔ لیکن مشورے کا کوئی تفصیلی ضابطہ منصوص نہیں ہے۔ اس کی بہت سی صورتیں ممکن اور مباح ہیں۔ خلافت راشدہ میں جو صورتیں اختیار کی گئی

تھیں وہ سب بھی منصوص نہ تھیں، بلکہ چند مباح صورتوں کو وقت کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے اختیار کر لیا گیا تھا۔ ہمارے لیے بالکل جائز ہے کہ اپنے حالات و ضروریات کے لحاظ سے ہم کچھ دوسری مباح صورتیں اختیار کریں۔ خلافت راشدہ میں کچھ مخصوص اسباب کی وجہ سے اہل حل و عقد آپ سے آپ معلوم تھے۔ اس وقت ان کے انتخاب کی حاجت نہ تھی۔ اب ہم اپنی ضروریات کے لحاظ سے اہلِ شوریٰ کے انتخاب کا ایک ضابطہ تجویز کر سکتے ہیں۔ آپ اس ضابطہ کے لیے نص نہ تلاش کریں، بلکہ یہ دیکھیں کہ بہت سی ممکن و مباح صورتوں میں سے جو صورت مسودے میں تجویز کی گئی ہے آیا وہی مناسب ہے یا آپ کی رائے میں کوئی دوسری صورت اس سے مناسب تر ہے؟ اسی طرح مجلس شوریٰ کے لیے جو آئینی طریق کار تجویز کیا گیا ہے اس کی بیشتر تفصیلات بھی مباحات کے قبیل سے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان کے بجائے دوسری متبادل صورتیں مباحات میں سے سوچ سکتے ہیں مگر کسی تجویز کو نہ اس بنا پر رد کر دیجیے کہ یہ طریقہ خلافت راشدہ میں رائج نہ تھا، اور نہ کسی دوسری تجویز پر صرف اس لیے اصرار کیجیے کہ یہی طریقہ اس زمانہ میں رائج تھا۔ البتہ آپ کو یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ اس وقت ہمارے لیے ان مباح طریقوں میں سے کونسا طریقہ مناسب ہے جو اسلامی نظام کے شوروی مزاج سے قریب ترین مناسبت بھی رکھتا ہو اور ہمارے حالات و ضروریات کے لحاظ سے بھی موزوں ترین ہو۔

یا مثلاً امارت کے باب میں جو کچھ نص سے ثابت ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر اجتماعی ہیئت ایک امیر یا امام کے تحتِ امر ہونی چاہیے، اور اس کو زمام کار سونپنے کے بعد اس کی اطاعت فی المعروف ہونی چاہیے۔ نیز یہ اصول بھی نصوص کے اشارات اور صدر اول کے تعامل سے ثابت ہے کہ یہ صاحب امر جماعت کا معتمد علیہ ہونا چاہیے اور اسے اُسی وقت تک صاحب امر رہنا چاہیے جب تک اسے جماعت کا اعتماد حاصل رہے۔ ان اصولی باتوں میں ہم کوئی رد و بدل نہیں کر سکتے۔ اب رہے یہ سوالات کہ امیر جماعت کا انتخاب بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ؟

طریقِ انتخاب کیا ہو؟ انتخاب کسی مدت کے لیے ہو یا بلاتعین مدت؟ امیر کو کن حالات میں معزول کیا جا سکتا ہے اور اس کا ضابطہ کیا ہے؟ امیر اور شوریٰ میں اختلافات کی مختلف ممکن صورتوں کا کیا حل ہے؟ جماعت کا اعتماد کھو دینے کی صورت میں امیر اور مجلس شوریٰ، دونوں میں سے ہر ایک کو کیا کرنا چاہیے؟ اور امیر کے اختیارات کن حدود سے محدود ہونے چاہئیں؟ یہ اور اس طرح کے متعدد دوسرے دستوری سوالات اُن اُمور میں سے ہیں جن میں شریعت نے ہم کو کسی ایک طریقِ کار کا پابند نہیں کر دیا ہے۔ اس لیے ہم بہت سی مباح صورتوں میں سے کسی ایک کو اپنے حالات و ضروریات کے لیے موزوں ترین دیکھ کر اختیار کر سکتے ہیں۔ رفقاء جماعت کو چاہیے کہ اسی نقطۂ نظر سے ان سوالات کے جوابات مجوزہ دستور میں تلاش کریں اور ان پر غور کر کے رائے قائم کریں کہ آیا کسی سوال کا اس سے بہتر جواب ان کی نگاہ میں ہے؟

مجوزہ دستور پر غور کرتے وقت رفقاء کو تین چار باتیں اور بھی ذہن میں رکھنی چاہئیں:۔

اول یہ کہ جماعت کے ارکان اور کارکنوں کا جو اخلاقی معیار اس وقت ہے، صرف اسی کو سامنے رکھ کر نہ سوچیں بلکہ ایسے حالات کو بھی نگاہ میں رکھیں جبکہ خدانخواستہ اس معیار میں کچھ تنزل رونما ہو جائے۔ اس امکان کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ غور کرنا چاہیے کہ جو احتیاطی تدابیر اس دستور میں تجویز کی گئی ہیں وہ کس حد تک کافی اور مناسب ہیں۔ امکانات کا یہ پہلو نگاہ میں نہ رہنے سے اندیشہ ہے کہ ہمارے بہت سے رفقاء کو متعدد احتیاطی تدابیر جماعت کی موجودہ حالت کے لحاظ سے غیر ضروری محسوس ہوں گی۔

دوم یہ کہ "طریقِ کار" کے عنوان سے جماعت کی جس پالیسی کو مجوزہ دستور میں واضح کیا گیا ہے اس کا بڑا حصہ اصولاً صرف اُن حالات سے تعلق رکھتا ہے جبکہ ملک کے سیاسی نظام میں جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام کرنا کسی درجہ میں بھی ممکن ہو۔ ان حالات کے بدل جانے کی صورت میں طریقِ کار کے متعدد اجزاء پر نظرِ ثانی کی جا سکتی ہے، مگر اس کی فی الوقت کوئی ضرورت

نہیں ہے۔

سوم یہ کہ اس جماعت کی حیثیت بعینہٖ "امت" کی سی نہیں ہے بلکہ امت کے اندر ایک ایسی جماعت کی سی ہے جو فریضۂ اقامت دین سے امت کی عام غفلت کو دیکھ کر اس لیے منظم کی گئی ہے کہ اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے خود کوشش کرے اور بتدریج پوری امت کو اپنی اس کوشش میں شریک کر لے۔ اسی بنا پر رکنیت کی شرطیں، ارکان کے فرائض، ارکان کے حقوق، اور جماعت سے ارکان کی علٰحدگی کے بارے میں آپ کو متعدد ایسی چیزیں نظر آئیں گی جو "رکن جماعت اسلامی" اور "فرد ملت" کی حیثیتوں کو خلط ملط کر دینے کی صورت میں وجہ پریشانی بن سکتی ہیں۔ لہٰذا اس اختلاط حیثیات سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

چہارم یہ کہ اس جماعت کے اصول اور مزاج کو دنیا کی دوسری جماعتوں کے اصول اور مزاج سے کوئی مناسبت نہیں ہے، اس لیے اس کے دستوری خاکے پر غور کرتے ہوئے دوسری جماعتوں کے دستوری طریقے آپ بھول ہی جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ اگر ان کی نظیریں آپ کے ذہن میں گھومتی رہیں گی تو قدم قدم پر آپ کو الجھنیں پیش آئیں گی۔ اسلام میں جمہوریت تو ضرور ہے، مگر یہ دوسروں کی مقلد جمہوریت نہیں ہے بلکہ اپنے اصول اور مزاج میں مستقل اور منفرد ہے۔